پروفیسر انور رومان
مترجم: پروفیسر انعام الحق کوثر

کوئٹہ وقلات کے براہوئی

براہویوں کے حالات کا مطالعہ کر کے ہم ان سے ناقابل تعرض خصوصی نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ مستقبل کی نشاندہی تاریخ کا منصب نہیں تاہم سماجی ہیئت اجتماعی کے خصائص کو عیاں کرنا اس کے دائرۂ عمل میں آجاتا ہے۔ جن کو زمانے نے پرکھا ہے اور جن کے آئندہ حالات وواقعات کو متاثر کرنے کے امکانات ہیں۔ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" ایک پرانی کہاوت ہے۔ لیکن اسے ماضی کو متحمل مزاج سے سمجھنے کے امکان کو خارج نہیں کر دینا چاہیے کیونکہ وہیں (ماضی) سے ہم انسانی ارتقاء کی سب منزلوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس سے قبل از وقت دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ گویا ہر اچھی بات کو رشک سے پُر، امنگوں کے ساتھ سمویا جائے اور ماضی کی رجعت پسندانہ اور لکیر کی فقیر باتوں کو کالعدم قرار دے دیا جائے۔ یہی ایک راہ ہے جس پر گامزن ہوتے ہوئے ہم ایٹمی دور میں انسانیت کے جہاز کو واضح فضا میں کھینے کے لیے تاریخ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو ایک ایسے ماحول کی تخلیق کر سکتے ہیں جو ایک روشن مستقبل کی تعمیر میں معاون ثابت ہو سکے۔ ان اشارات وکنایات کے ساتھ ہم خاص نتائج اخذ کرنے کی کوشش کریں گے جو کم از کم ہمیں براہویوں کو بہتر سمجھنے اور ان کے انتظامی نظام سے آگاہ ہونے میں مدد ہو سکیں۔

اوّلاً: قلات ایک قبائلی ریاست تھی جس کا مقصد براہویوں کو ایک مرکز پر جمع کیے رکھنا اور ان کی اجتماعی زندگی کو منظم کرنا تھا۔ بہرحال یہ غیر تغیر پذیر بھی نہ تھی۔ اس نے اپنی آبادی میں مختلف نسلی اجزا کو سمو کر اور نظم مدنی میں قدیم اور مقدس دستور کو اپنا کر اچھی خاصی جذب پذیر

استعداد کو رونما کیا تھا۔ لیکن وہ اساسی طور پر براہوئی ہی رہے۔ ایک مرتبہ جب براہوئی اثر سے متاثر لوگ حلف اٹھا لیتے اور ریاست کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرتے تو وہ اسی میں مدغم ہو جاتے تھے۔ ہر نوع ریاست کے کوہستانی مزاج اور اس کی طوفانی مراکز سے علاحدگی نے خلوت پسندی، ذاتی اُنسیت اور فیٹشش پرستی (اصول یا عقیدہ جسے بے دلیل اندھا دھند مانا جائے) کی تخلیق کی۔

میر نصیر خاں اوّل نے زبان اور تہذیب کی وفاداریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی اساسی سیرت میں تبدیلی پیدا کی۔ اس نے صرف ملک کی وفاداری، مدافعانہ اور جارحانہ ذمہ داریوں پر زور دیا جس کے طفیل ریاست کی خاطر مگسی، رند وغیرہ نئے ممبر شامل ہوئے لیکن ریاست اپنی اساسی ہیئت سے مزید آگے نہ بڑھ سکی۔ لہٰذا زیادہ بلند و مستوری تدابیر اختیار نہ کی جا سکیں جس سے براہوئی قومیت کے نظریہ کی توسیع ہوتی اور اس کے دائرۂ عمل میں وسعت پیدا ہو جاتی۔ درۂ بولان کے شمال اور شمال مشرقی علاقوں (مری بگٹی، ہورنڈ اور داجل) کا تو ذکر ہی کیا۔ لس بیلہ، مکران، خاران جو براہویوں کی ریاست کے ساتھ ڈیڑھ سو سال تک ملحق رہے وہ بھی اس سے کامل اتفاق اور اتحاد نہ کر سکے۔

ایم۔ ایس خاں (صفحات ۱۲۴ و ۱۲۵) کے الفاظ میں "براہویوں کے تنگ اور محدود جذبہ نے قومی یا تہذیبی حیات کی کوششوں میں کبھی بلوچوں کو اپنے ساتھ ہم آہنگ نہ کیا۔" وہ مزید لکھتا ہے: "قلات کی حکومت کا محض مطلب قلات کے مرکزی براہوئی قبائل کا اتحاد تھا ـــــ قلات کے بہت کم حکمرانوں نے متحدہ بلوچستان کی ضرورت کو محسوس کیا۔" حقیقت میں میر نصیر خاں کی اس صورت حال میں تبدیلی اس کی اپنی جانب سے اعلانیہ اعتراف کی مظہر تھی کہ براہویت ہمسایہ سرزمین میں زیادہ کامیابی کے ساتھ پھل پھول نہیں سکتی۔ چنانچہ دیگر تہذیبی گروہوں کی خود اختیاری اور یکساں حیثیت کی شناخت اس کے تحت دوسری وجوہ سے کہیں زیادہ توسیع کی ذمہ دار تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ براہوئی ایک تہذیب اور نظامِ سیاست کے علمبردار تھے جو خاص کر سارا وان اور جھالاوان کے کوہستانی خطوں سے میل کھاتا تھا اور جو اس لیے مختلف ماحول میں زندگی بسر کرنے والوں کے لیے بآسانی قابلِ قبول ہو سکتا تھا۔ اس لیے ریاست میں "مقامیت" نمایاں رہی، اور مسلسل نشو و نما کے امکانات کی کمی رہی۔ اپنے گہوارے میں یہ صرف ان کو جذب کر سکی جنھیں تاریخی قوتیں انھی مقبوضات میں لے آئیں۔ لیکن یہ خود بدلتے ہوئے وقت کا ساتھ نہ دے سکی اور وسیع تر زندگی کے نظریہ کو اپنا نہ سکی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہوا جیسے زمانۂ قبل از وادیٔ سندھ میں بلوچستانی کاشتکار برادریاں اپنی سب خوبیوں کے باوجود پھل پھول نہ سکیں اور پھر وادیٔ سندھ کی تہذیب کے مثل مختلف الاوضاع (مختلف العناصر) تہذیبی سانچے کے مترادف نہ ہو سکیں اور سختی سے مقامی اور مستغنی مزاج کی حامل رہیں جنھیں صرف اپنے آغاز کے باعث یاد رکھا جا سکتا تھا۔

ثانیاً: ریاست قلات کبھی بھی مکمل طور پر آزاد نہ رہی کیونکہ یہ ایران، افغانستان اور ہند و پاکستان کے مابین واقع تھی۔ اس حقیقت کے دو نتائج تھے۔ آزادی کا خاتمہ اور خان کا غیر ملکی گورنر کے ماتحت ہونا، اور دوسری ریاست کے ساتھ تحتی اتحاد (تحتی الحاق)، یا فروتر اتصال۔ براہویوں نے اوّل الذکر کی تند خوئی سے مخالفت کی۔ ارغونوں، مغلوں، افغانوں اور انگریزوں کے براہ راست فیصلہ کی کوششوں کی نہایت سختی سے مزاحمت کی گئی۔ لیکن ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مؤخر الذکر فروتر اتصال کو رضا کارانہ طور پر تسلیم کر لیا۔ مغل قندھار کی شکست کے بعد نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی ۱۷۵۸ء کے بعد اور انگریز ۱۸۴۱ء کے بعد عام طور پر اسی اصول پر عمل پیرا ہوئے۔

آج قلات ریجن مغربی پاکستان کے پسماندہ ترین حصوں میں سے ہے۔ کیونکہ کاشتکاری کے انتظامات کا انتہائی فقدان ہے۔ اس کا اشارہ براہوئی کی سب سے پیاری دعاؤں میں سے ایک میں یوں کیا گیا ہے:

"دریاں وہساہنک مُدکاتے آبادکرک غریباتا اُستے خوش مریر" (اے دریا بہتے رہو اور ملک کو زرخیز بنادو تاکہ غریب خوشی سے چہک سکیں)[1]۔

اور یہ بات بھی غیر اہم نہیں کہ ایک براہوئی عاشق اپنے محبوب سے پھول یا شراب کے پیالہ کی بجائے پانی کے ایک پیالہ اور محض پانی کے ایک پیالہ کی التجا کرتا ہے:

" اُزیبو نئے دیر ایتے" (اے زیبو (اری محبوبہ) مجھے تھوڑا سا پانی دو)

یہ بالکل بے فائدہ گیت نہیں ہے بلکہ اساسی معاشی حقیقت کا ایک شاعرانہ اظہار ہے[2]۔"نئے دیر ایتے" براہویوں کی ساری تاریخ، ماضی، حال اور مستقبل کی تصویر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس معاشی زیرباری کو ماضی کے بالمقابل زیادہ جمہوری اور وسیع سیاسی ساخت کے مابین قرینے سے سلجھانا پڑے گا۔ وہ تمام تحریکات جو مقامی نقطۂ نظر کی حامل ہوں گی ناکام رہیں گی خواہ یہ خطہ خود کفیل ہی کیوں نہ ہو جائے (تقریباً آئندہ دو نسلوں کے دوران) اس وقت تک تاریخ کے قوی قوانین آہستہ آہستہ تسلیم کردہ حقیقت کو حتمی طور پر منوالیں گے کہ صرف وہی علاقے اپنی آزادانہ ہستی کو برقرار رکھ سکیں گے جو معتدبہ انسانی قوت اور منابع کو اپنے اندر سموئے ہوں گے۔

تاثناً: اب تک براہوئی ریاست میں سب سے زیادہ اہم خصوصیت سرداروں کا ادارہ رہا ہے جن کی تعداد میر نصیر خان اوّل[3] کے عہد میں چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اُن کا براہوئی تاریخ پر اثر بہت کارگر اور فیصلہ کن رہا ہے۔ وہ ریاست کے لیے پشت پناہ اور ستون بن گئے۔ وہ افواج کے کماندار اور تہذیبی و معاشی نظاموں کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں تھامے

۱۔ ایچ ص ۱۱

۲۔ ایضاً ص ۱۲

۳۔ ہتورام ص ۱۰۲

رہے۔ بیسویں صدی میں چند شریف شخصیتیں جن میں نواب خان محمد خاں زرکزئی، سردار نورالدین مینگل اور نواب زادہ یوسف علی خاں مگسی شامل ہیں، انگریزوں کے خلاف لڑنے میں پیش پیش رہے۔ دراصل ساری براہوئی زندگی ان کے اردگرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک براہوئی کا اپنے سردار کی فرمانبرداری اور عزت و توقیر کی نمایاں خصلت نے سرداروں کو پٹھانوں کے مقابلہ میں زیادہ ذی اقتدار بنا دیا ہے۔

لیکن ان کا عوام سے برتاؤ بہتر نہیں رہا ہے۔ براہویوں کا سرداری نظام دوسرے موروثی نظاموں کی مثل سنجیدہ نقائص سے پُر ہے۔ کچھ سرداروں نے میر خداداد خاں کے عہد کی طرح بغاوتوں سے ریاست کی سالمیت کو خطرہ میں ڈال دیا۔ کچھ نے نورا مینگل کے معاملہ کی مثل آزادی کی تحریکوں کا گلا گھونٹنے میں مدد کی۔ ان کے علاوہ دوسروں نے لاابالی انداز سے زندگی بسر کی جب کہ اُن کے اردگرد چیتھڑوں میں ملبوس، بھوکوں مرنے والے اور ظلمت و گمراہی میں مبتلا لوگوں کا اجتماع تھا۔ "خوانین کی مطلق العنانی نے نسلی آزادی اور خودمختاری کے جذبہ کو دبا کر رکھ دیا اور اطاعت گزارانہ آبادی کی نشوونما کو پسند کیا جو غلامانہ زندگی بسر کرنے کی حد تک پہنچ گئی۔"[1] بے تفریق انگریزی وظائف کا واضح رجحان یہ تھا کہ ان کی عزتِ نفس، جذبۂ مستعدی اور اپنے اردگرد کی رعایا کے متعلق تشویش کو کچل کر رکھ دیں۔

قریباً تیس سال پیشتر برّے نے لکھا تھا "ایک بات کو دوسری کے ساتھ ملا کر میں یہ قابلِ افسوس نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ جب تک نفاق پیدا کرنے والے اثرات کو دبایا نہیں جائے گا اور متبادل اثر، جیسا کہ جرگہ نظام کی تطہیر اور استواری۔ سرعت کے ساتھ قبائلی اور نسلی تعاون میں نئی روح پھونک نہیں دے گا اور براہوئی قبائل اچھے دنوں سے دوچار نہیں ہوں گے تو براہوئی نسل کا مستقبل تاریکی سے دست و گریباں رہے گا۔

۱۔ ایم۔ ایس خاں بلوچ ص ۱۲۷

آپئے بعید مستقبل میں مزید قومی برادری میں جذب ہونے کے متعلق پُر امید رہیں[1]۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کا تقابلی مطالعہ سابقہ قلات کی آبادی میں مسلسل کمی کو ظاہر کرتے ہوئے چونکا دیتا ہے۔ ذیل کا گوشوارہ رونما کرتا ہے[2]

نام ضلع	آبادی ۱۹۰۱ء	آبادی ۱۹۵۱ء	بیشی کمی	انسان فی مربع میل ۱۹۰۱ء	انسان فی مربع میل ۱۹۵۱ء	بیشی کمی
ساراوان	۶۵،۰۴۹	۴۷،۲۵۴	- ۲۷٪	۱۴	۹	- ۵
جھالاوان	۲۲۴،۰۷۳	۱۰۱،۸۹۵	- ۵۵٪	۱۱	۵	- ۶
کچھی	۸۲،۹۰۹	۱۳۳،۷۹۶	+ ۶۰٪	۱۶	۲۵	+ ۹

اس طرح قلات ریاست کی ۱۹۰۱ء کی ساری آبادی ۳،۷۲،۰۳۱ کے مقابلہ میں تیزی کے ساتھ ۱۹۵۱ء میں ۲،۸۲،۹۴۵ رہ گئی۔ گویا ۵۰ سال کے عرصہ میں قریباً ۲۵ فی صد کی تخفیف واقع ہوئی۔ کتنا تعجب ہے کہ جھالاوان سب سے زیادہ کمی سے اثر پذیر ہوا جو کہ براہویوں کا حقیقی مسکن ہے۔ ساراوان میں بھی ان کی تعداد کافی ہے۔ اس میں آبادی ۲۷ فی صد گھٹ گئی۔ کچھی کا زرخیز میدان اس کی امکانی زرعی دولت کے باعث آبادی میں ساٹھ فی صد کی بیشی سے دوچار ہوا۔ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ انگریز براہویوں کے ساتھ متکبرانہ طرزِ عمل سے پیش آئے ہوں گے۔ لیکن اس ریجن کے بارے میں انگریزوں کی حکمت عملی یکساں تھی اس لیے اسے بہ حیثیت مجموعی پرکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ علاقے (قبائلی اور بظاہر

۱- ڈینس برے: براہوئی زبان، حصہ اوّل، ص ۵

۲- ۱۹۰۱ء کے اعداد و شمار امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، جلد ۶، ص ۳۴۱ میں سے لیے گئے۔ ۱۹۵۱ء کے اعداد و شمار "مردم شماری رسالہ" (Census Bulletin) نمبر ۳ گورنمنٹ آف پاکستان ستمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۲ سے ماخوذ ہیں۔

آزاد) جو براہِ راست انگریزی نظم و نسق کے تابع تھے انھوں نے سوائے ژوب کے آبادی میں ایک واضح اور زیادتی کے رجحان کو ظاہر کیا۔ جیسا کہ یہ گوشوارہ تصویر کشی کرتا ہے[1]:

علاقہ	آبادی ۱۹۰۱ء	آبادی ۱۹۵۱ء	بیشی کمی ۱۹۰۱ء	انسان فی مربع میل ۱۹۰۱ء	بیشی کمی ۱۹۵۱ء
خاران	۱۹،۶۱۰	۵۴،۵۷۳ + ۱۷٪	۱	۳	۲ +
مکران	۷۸،۱۹۵	۱۳۸،۶۹۱ + ۷۵٪	۳	۶	۳ +
لس بیلہ	۵۶،۱۰۹	۷۵،۷۶۹ + ۴۸٪	۹	۱۱	۲ +
مری	۲۰،۳۹۱	۳۲،۴۶۴ + ۶۰٪	۶	۱۰	۴ +
بگٹی	۱۸،۵۲۸	۲۷،۹۰۷ + ۵۰٪	۵	۷	۲ +
چاغی	۲۱،۶۸۹	۳۷،۲۳۶ + ۵۵٪	۱	۲	۱ +
لورالائی	۶۷،۸۶۴	۹۷،۴۹۶ + ۴۸٪	۸	۱۳	۵ +
سبی	۷۵،۸۲۹	۱۴۸،۹۰۰ + ۹۶٪	۱۸	۳۳	۱۵ +
کوئٹہ پشین	۱۱۴،۰۸۷	۲۱۲،۸۸۵ + ۸۶٪	۱۷	۴۰	۲۳ +
ژوب	۶۹،۷۱۸	۶۵،۴۷۰ - ۶٪	۷	۶	۱ -

قلات کی آبادی میں اس تخفیف کے اسباب کا کھوج زیادہ مشکل نہیں۔ اس کی زیادہ تر ذمہ داری اس علاقہ کے معاشی نظام پر ہے۔ اور اسی میں سردار براہ راست شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ خاران کی آبادی میں سب سے زیادہ بیشی ہوئی۔ اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ اس ضلع کا صرف ایک سردار ہے اور وہی وہاں کا سربراہ رہا۔ براہوئیوں کی

۱۔ امپیریل گزٹیئر آف انڈیا ص ۳۴۱، برائے اعداد و شمار ۱۹۰۱ء۔ اور مردم شماری کا بلیٹن ص ۳ برائے اعداد و شمار ۱۹۵۱ء

تعداد میں کمی اس امر کا نتیجہ نہیں کہ انھیں اکتوبر کے مہینہ میں سندھ کی طرف عارضی اور فصلی نقل مکانی کرنی پڑتی تاکہ وہ چاول، جوار، گندم اور جَو کی کٹائی میں حصہ لے سکیں۔ اور جون میں واپس آکر اپنے مادرِ وطن میں جولائی اور اگست میں آرام کر سکیں جس کے وہ سخت محنت کے بعد حقدار بنے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ یہ نقل وطن کرنے والے بلوچستان سے ورے قیام پذیر ہو جاتے تھے۔ لیکن اس نقل مکانی کا توازن سابقہ صوبجات متحدہ (بھارت)، سندھ، پنجاب اور سرحدی علاقوں کے نوآبادکاروں سے یکساں رہتا۔ پھر یہ نقل مکانی علاقہ قلات سے ہی مختص نہیں یہ سارے سرحدی علاقہ میں عام ہے۔ براہوئی جو اپنی سرزمین سے انتہائی متعلق ہیں، اُن کے لیے قبائلی مسکن کو خیرباد کہنا معمولی بات نہیں جب تک نسلاً بعد نسلٍ مسلسل معاشی نفع گیری اور انحطاط رونما نہ ہو جائے۔ حکومت کی جانب سے حالیہ ترقی کی سکیموں پر عمل درآمد ان کی آبادی میں تخفیف کو روکنے میں خاصی معاون ثابت ہوں گی۔ لیکن صرف حکومت ہی اس پیچیدہ مسئلہ کی گرہ کشائی نہیں کر سکتی۔ آج کے براہوئی سب سے بالاتر خوف سے آزادی، عُسرت سے آزادی، اپنی محنت کا پھل چکھنے کی آزادی اور طریق کار کی آزادی چاہتے ہیں۔ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ نئے حالات کے پیش نظر وہ تیزی سے ترقی کریں گے اور زیادہ روشن بن جائیں گے بیشتر اس کے کہ میں براہویوں کے اس مختصر تذکرہ کو ختم کردوں، میں ایک بے باک سوال حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ براہویوں کی امکانی قوتیں کیا ہیں؟ جو اُن کو حالیہ ارتقا کی روشنی سے بہرہ ور ہونے کے قابل بنا سکتی ہیں۔

براہوئی عام طور پر سادہ، ایماندار، بے لاگ، قدامت پسند، اپنے دستور سے اثر پذیر اور اپنے سرداروں کے مطیع ہیں۔ وہ کیوں مطیع اور مصائب کو جھیلنے کی ایک طویل تاریخ کے باوجود ہیرو پرستی کی جانب راغب رہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ وہ کیوں آلۂ کار اور چپ سوانگ کی حیثیت اختیار کیے رکھے؟ اور انھوں نے اپنی ساری

تاریخ کی دوڑ میں کبھی اس عائد شدہ ترتیب کو بدلنے کی کوشش نہ کی؟ تاریخ قلات دوسری مسلم حکومتوں کی طرح بغاوتوں سے پُر ہے۔ لیکن ایک بھی بغاوت کا سرچشمہ قبائلی نہ تھے۔ اگرچہ وہ ان بغاوتوں کی پشت پناہ ضرور رہے۔ یہ سادہ لوحی کیوں؟ یہ ہیرو پرستی کیوں؟ آخر کار کیوں ایسا وقوع پذیر ہوا؟

انگریز اس غیر متغیر فرمانبرداری کے اسباب سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ وہ سرداروں کو قابو کر کے اپنی جارحانہ حکمت عملی کی اعانت کی خاطر بروئے کار لائے۔ یہ اسی ناعاقبت اندیش یقین کے بُرے اثرات تھے کہ انگریز اپنی گرفت کو مستحکم کر سکے۔ اور پٹھانوں کے قبائلی علاقہ کے مقابلے میں سابقہ بلوچستان میں کہیں تیز تر پیش قدمی کر سکے۔ پٹھانوں کے قبائلی علاقہ میں اُن کی رفتار بہت کم ہی نہیں بلکہ قریباً ناقابل اہمیت تھی۔ کیونکہ ان کے ہاں قبیلوں اور سرداروں کے مابین تعلقات میں قومی رنگ غالب تھا۔ یہی سنڈیمن کے نظام کا راز تھا[1]۔ اس کے برعکس اس علاقہ کے موجودہ ادعائی تاریخ دان شاید اس پتھر میں تبدیل شدہ فرمانبرداری کو سرداروں کی حقیقی شاہی خلعتوں کے لیے ایک مزید تمغہ قرار دیں۔ لیکن ایک غیر متعصب اور ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے والے تاریخ کے طالب علم کے لیے نہ یہ سوال مزید طاق میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے متصوفانہ جذبات کے لبادے اوڑھائے جا سکتے ہیں۔ یہ براہوئی دماغ کا میلان نہایت اختصار کے ساتھ براہوئی زندگی کے سارے نظام کو پیش کر دیتا ہے۔

انسانی ارتقا کا انحصار اس حد تک ہے کہ انسان فضا کو فتح کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو سکے ہیں۔ لیکن حالیہ انوکھی ترقی اور موجودہ یورپ کی سب سے

۱۔ امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا جلد چھ آکسفورڈ ۱۹۰۸ء، ص ۲۹۰، اور فریزر ٹیٹلر: افغانستان آکسفورڈ ۱۹۵۰ء ص ۱۸۲۔

پیش اقوام کی زیادہ تکمیل یافتہ سائنسی کاریگری کے باوجود فضا کافی حد تک انسانی گرفت سے گریزاں ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی دیر کے لیے اپنے ماحول (فضا) کے ساتھ حالیہ آویزش سے آنکھیں بند کرلیں، اور قدیم ماضی کا تصور کریں تو ہم ماحول کو مکمل طور پر طاقتور، مکمل طور پر سرایت کن اور انتہائی حد تک غالب پائیں گے۔ انسان اس کے مختلف پہلوؤں کے سامنے قریباً صفر کے برابر ذرّہ کی مانند تھا۔ اس کی سعی محض آہ و فغاں پر مبنی تھی اور اس کے اوزار بے سود اور بے ڈھنگے تھے۔ ہر لمحہ وہ گھنے جنگلوں، تیز دھار دریاؤں، ٹھوس اور کریہہ المنظر پہاڑوں، لامحدود صحراؤں وغیرہ سے مغلوب تھا۔ وہ علم اور منابع کے لحاظ سے محدود تھا۔ وہ دہشت زدہ اور بے حد رعب سے متاثر ہو چکا تھا۔ اس کے خوف زدہ دماغی وہم نے ان تمام تحکم پسند مظاہراتِ فطرت کو معبود سمجھ لیا۔ وہ ماحول کے سامنے ناصیہ فرسائی کرنے لگا۔ اور اس نے معبودوں کو خوش کرنے کے لیے مضطربانہ کوششیں کیں، اور ان ناگزیر دیوتاؤں کے غصّہ کو فرو کرنے کے لیے انسانی قربانیوں سے بھی دریغ نہ کیا۔ چند سو سال گزرنے کے بعد انسان زیادہ ترقی پذیر ہو گیا۔ اس کے اوزاروں میں تبدیلی رونما ہوئی۔ اب وہ جنگلوں کو کاٹ کر ایندھن کے طور پر جلانے لگا۔ اور کھیتوں میں کاشتکاری کرنے لگا۔ اس نے تاجرانہ کاروبار کے لیے دریاؤں میں کشتیاں کھینی اور نہروں کو کھودنا شروع کیا۔ وہ اپنے ریوڑوں کو پہاڑوں پر چرواتے اور صحراؤں میں نخلستان ڈھونڈنے لگا۔ لیکن خوف زدہ دماغی وہم جو عریض و بسیط کائنات نے اس میں نفوذ کر دیا تھا، ابھی اس کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اگرچہ اُس نے اسے زیادہ سے زیادہ انسانی دیوتاؤں، ہوس پرست جنگی سرداروں، بڑھتی ہوئی آبادی کی مصنوعات اور معاندانہ مفاد کے سامنے جھکا دیا۔

دوبارہ اس جادو کے دریچہ پر اپنی آنکھیں بند کیجیے۔ اور موجودہ دور کے کسی ملک میں آنے کی بجائے برا ہوئی سرزمین میں وارد ہو جایئے جہاں پہاڑ اور صحرا اس پر قبضہ جمانے

کے لیے مقابلہ کرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ فطرت، ماحول، اور جنگی سردار ہمیشہ کی طرح غالب ہیں۔ یہاں وقت کی رفتار مدہم ہے۔ پہاڑ اور صحرا جوں کے توں ڈراؤنے اور مہیب ہیں، اور اسی طرح یہاں کے آقا یعنی سردار اسی خوف زدہ دماغی وہم کے قدیم سیاق و سباق میں ایک عام برابری جو علم اور ذرائع کے اعتبار سے محدود ہے یقیناً ان صحراؤں، پہاڑوں اور سرداروں میں ایک ایسی چیز پاتا ہے جو ماخوق البشر اور مافوق الفطرت ہوتی ہے تو وہ ان کے سامنے احترام کے طور پر نہیں بلکہ خوف کے باعث جھک جاتا ہے۔

یہ شاعرانہ من کی موج نہیں۔ یہ جغرافیہ کا ناقابل انکار تصادم ہے۔ قلات ایرانی سطح مرتفع کی مشرقی ڈھال ہے جو پروفیسر رسل اور کنفن کے خیال کے مطابق "افریقہ کے بحیرہ روم کے مغربی ساحل سے کرتھار اور مشرق میں سلسلۂ سلیمان کی خشک تہذیبی دنیا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس خشک دنیا میں فطرت زندگی کی ضرورت مہیا کرنے میں بخیل واقع ہوئی ہے۔ یہاں کا طبعی ماحول انسانی صبر و تحمل کی قوتوں کا شدید امتحان لیتا ہے۔ یہاں کے وسائل کا غیر ماہرانہ استعمال بعض اوقات موت پر منتج ہوتا ہے۔ اگر یہاں فطرت سنگ دل واقع ہوئی ہے تو انسان اس سے بھی زیادہ جابر اور مطلق العنان ہیں۔ شدید خواہشات، حرص و طمع اور جذبہ انتقام عموماً اس کے محرکات ہیں۔ اس خشک دنیا کا معتدبہ حصہ "بلدالخوف" ہے۔ یہ اصطلاح Saharam "خوفناک ملک" کے لیے استعمال کرتے ہیں[1]۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ "انگریزوں کے طویل تسلط اور پاکستان کے سیاسی حصے کے طور پر بلوچستان دنیا کا مخصوص خشک خطہ ہے۔ یہاں آبادی کی قلت اور باشندوں

۱۔ رسل اور کنفن۔ کلیجر ولڈز۔ نیویارک ۱۹۵۳ء، ص ۲۵۱ ــــ "خشک دنیا" کے ستائیسویں اصل عنوان "طبعی پس منظر" کا ابتدائی پیراگراف۔

کی کم تعداد اس کے وسیع صحراؤں کا پتہ دیتی ہے۔"[1]

پروفیسر ایچ۔ ایل کاجی یوں صحراؤں اور پہاڑوں کے باعث پیدا شدہ ذہنی خصائص بیان کرتے ہیں[2] "صحراؤں میں زندگی کی صورتیں مشکل ہیں۔ لوگوں کو مستقل طور پر ایک نخلستان سے دوسرے نخلستان کی طرف رواں رہنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح وہ قدرتی طور پہ خانہ بدوش اور ادھر اُدھر گشت لگانے والے بن جاتے ہیں۔ سخت زندگی ان کو جفاکش اور صحرا کے خطرات ان کو جری اور خطر پسند بنا دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ بے تکلف اور چند ہی خیالات کے مالک بن جاتے ہیں .... آزادانہ بدوی زندگی خود مختاری اور صاف گوئی کے شعور میں جان ڈال دیتی ہے ..... بدیں وجہ یہ لوگ نظم وضبط کے زیادہ ذمہ دار نہیں ہوتے۔ یہ کہنا مقصود نہیں کہ وہ تعاون نہیں کرتے وہ ادھر ادھر گروہوں میں رواں دواں رہتے ہیں۔ اور یہ ایک گروہ کا تعاون قبائلی وفاداری اور نمک حلالی کے جذبہ کی تخلیق کی صلاحیت رکھتا ہے۔" وہ مزید بیان کرتا ہے کہ[3] "ایک سخت زندگی، وادیوں میں تنہائی اور میل جول کی مشکلات، کوہستانی کیفیات کے مخصوص خط وخال ہیں۔ اسی لیے ان خطوں کے لوگ قوی ہیکل، بہادر اور آزادی پسند ہیں۔ لیکن اکثر بہت سادہ، پسماندہ، غیر ترقی یافتہ، سست اور بے حس ہیں۔ وہ بنیادی طور پر قدامت پسند ہیں۔ اُن کا ماحول اُن کو تبدیلی کی ترغیب

۱۔ ایضاً۔ ایضاً، ص ۳۱۱۔ "خشک دنیا" کے بتیسویں اصل عنوان "جنوب مغربی سطح ہائے مرتفع" کے تحت موضوع "بلوچستان" سے لیا گیا۔

۲۔ "عمومی جغرافیہ کے اصول" (Principles of General Geography)

آکسفورڈ ۱۹۴۸ء، ص ۱۹۹، ۲۰۰

۳۔ ایضاً، ص ۲۰۰ تا ۲۰۲

نہیں دیتا۔ اور بیرونی اثرات اُن سے ورے رہتے ہیں۔ . . . . یوں سلسلہ ہائے کوہستانی علاحدگی اور الگ تھلگ ہونے کے باعث اکثر قدیم رسوم اور روایات کو محفوظ رکھتے ہیں . . . . کوہستانی لوگوں میں صحرائی لوگوں کی مثل تاخت و تاراج ایک نیکی کی صورت اختیار کرلیتی ہے جو ماحول کی واضح جواب وہی ہے اور جو آخر کار متاثرہ لوگوں کے اخلاقی ضابطہ کی آئینہ دار ہے . . . . . پابند ماحول خصوصیت کے ساتھ گروہ اور قبائل کی تشکیل اور اگر مرکزی شخصیت کمزور ہو جائے تو محدود پیمانہ پر جاگیرانہ اور جمہوری طرز حکومت کے قیام کو عمل میں لاتا ہے۔ . . . سلسلہ ہائے کوہستان میں ہم اکثر جاگیرانہ گروہ کے قوی اور طاقتور سرداروں اور آقاؤں سے دوچار ہو ستے ہیں۔ کوہستانی اپنے آبائی سردار کا وفادار ہے اور مدّت سے قائم شدہ ضابطہ سے پیوستہ ہے۔ اور اسی وجہ سے جاگیرانہ نظام اس کی جبلّی قدامت پسندی کو مرغوب آتا ہے۔ . . . جس سے ناپسند مرکزی نظام کی حامی شخصیت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہر جگہ کوہستانیوں کی ایک امتیازی خوبی ہے۔"

طبعی ماحول کے بارے میں اس وقت موجود تمام مستند مآخذ کے مذکورہ بیانات سے توثیق کی جاسکتی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ براہویوں میں اپنے سرداروں کی اندھا دھند اطاعت کے متعلق ہماری تفصیلات سے کوئی بھی اختلاف نہیں کرتا۔

طبعی ماحول سے پیدا شدہ قدامت پسندی اور خوف کے ذہنی الجھاؤ سے براہویوں کی چراگاہوں میں بادیہ پیمائی اور خانہ بدوشی کا گہرا تعلق ہے۔ یہاں رسل اور کنفن کا ایک اور اقتباس پیش کیا جاتا ہے[1]: "اس مخصوص خشک دنیا کے باشندے

[1] ایکلچر ولڈ، ص ۲۶۴۔ "خشک دنیا" کے اٹھائیسویں اصل عنوان "باشندگان خشک دنیا" کے تحت موضوع "اقتصادیات" سے لیا گیا۔

چراگاہوں کے بادیہ پیما ہیں۔ یہاں چند مفید مطلب مقامات کے سوا کہیں زراعت نہیں کی جاسکتی۔ . . . . . اس خشک دنیا کے معاشرے میں زمیندار طبقہ الگ تھلگ رہتا ہے۔ جو اراضی وہ کاشت کرتے ہیں وہ بالعموم دوسروں کی ملکیت ہوتی ہے اور اس کی پیداوار میں سے صرف پانچواں حصہ اُسے ملتا ہے۔"[1]

یہ دیہی خانہ بدوش جو "گدانہ" یا پشمینے کے خیموں میں رہتے ہیں اور کم از کم ممکن ضروریات پر بسر اوقات کرتے ہیں وہ اپنا اکثر وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے گلّے چراتے پھرتے ہیں جو ان کی دولت ہے۔ قدرتی طور پر ان کے پاس وقت کم ہوتا ہے کہ وہ یہ سوچیں کہ کیسے اپنے سرداروں کے ساتھ تعلقات کو نئی صورت بخشی ہے۔ اور اگر وہ ایسا کریں تو وہ فرائض کو نبھانے میں بدقسمت ثابت ہوں۔ نہایت دشوار طریقہ جس سے وہ اپنی روزی کماتے ہیں اُن کے پاس فالتو وقت کم ہی رہنے دیتا ہے۔ جس میں وہ شہریت بالخصوص سیاست اور انتظامی امور کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ پہاڑ اور سرد صحت مند تعلقات کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور ان کو زیادہ سے زیادہ بے مونس وغم خوار اور انفرادیت پسند بنا دیتے ہیں۔ یہی دیہی معیشت سرداروں کا مگنا کارٹا (Magna Carta) ہے۔

مواصلات کے ذرائع کا فقدان فرمانبرداری کا ایک اور سبب ہے۔ بیرونی رسم و راہ عملی طور پر ناممکن ہے۔ اس لیے زیادہ آزادی و خود مختاری اور جمہوری حکومتوں کے لیے دُور کی تحریکیں یا تو ان دُور افتادہ مقامات پر اثر انداز نہیں ہوتیں یا مون سون ہواؤں کی طرح اپنی طاقت کھو دیتی ہیں جو بنگال سے مغرب کی طرف چلتی ہوئی مغربی پاکستان کے سرحدی حصوں میں خشک ہو جاتی ہیں۔

۱۔ ایضاً، ص ۲۶۶

لیکن یہ غالب آنے والا ماحول ہمیں مایوس نہیں ہونے دیتا۔ اسے ضرور مواصلات کے اصلاح یافتہ ذرائع کے ذریعہ فتح کیا جا سکتا ہے اور اس کے دور افتادہ حصوں کو بندوں اور پشتوں کی تعمیر، نہروں کے اجرا، تعلیم کے پھیلاؤ، علاج کی سہولتوں کی بہم رسانی پہاڑوں کی کھدائی اور اس کے خزانوں سے استفادہ اور بیرونی تعلقات کی حوصلہ افزائی سے ملایا جا سکتا ہے۔ جونہی یہ کام سرانجام پائیں گے جیسا کہ اب کوشش جاری ہے یہ کوہ و صحرا اپنے اسرار کھو بیٹھیں گے۔ ان کا "دستور" جدت اور جمہوریت اختیار کرے گا۔ یہاں کی گلہ بانی کی معیشت ترقی پائے گی۔ ان کی محض اطاعت گزاری رُو بہ انحطاط ہو جائے گی۔ اور براہوئیوں کی دُنیا میں ایک تغیّر رونما ہو جائے گا۔ یہ ان کی بود و باش کے لیے بہتر اور خوش حال جگہ بن جائے گی۔ اگر پاکستان کو اپنا مقرر کردہ نصب العین بروئے کار لانا ہے تو اسے لازماً ان علاقوں کے طبعی ماحول میں تغیّر اور تبدیلی پیدا کرنا ہو گی۔

جب یہاں طبعی ماحول کا بوجھ اٹھ جائے گا تو ہم دیکھیں گے کہ براہوئی عام انسانی سطح پر آجائیں گے۔ یہ اپنی جسمانی ساخت میں نہ دیو پیکر رہیں گے اور نہ پست قامت۔ نہ متشدّد رہیں گے نہ بے دین۔ نہ کبھی بغاوت پسند ہوں گے اور نہ غلامانہ ذہنیت کے حامل۔ یہ مثالیت (عمومیت) انھیں ایک متوازن اور معتدل نقطۂ نظر (تصورِ حیات) عطا کرے گی جس کو براہویت کے چار اساسی خصائص کی بنا پر چار حصّوں میں منقسم اور تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں پہلی چیز مناسب حالات کے رنگ میں رنگے جانے کی لوچ اور لچک ہے۔ براہوئی اپنے معاشرتی نظام میں کبھی کٹر اور سخت گیر نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ نو واردوں کے لیے اپنے دروازے وا رکھے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نئے اثرات کی دسترس سے باہر نہیں۔ دوسری خصوصیت کا تعلق ان کی اندرونی وحدت اور اتحاد کی بندشوں اور بندھنوں سے ہے۔ ان کا مشترک نسب اور

نسل ان کے نصب العین (آئیڈیالوجی) سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ درحقیقت ان کی متحد اور اکٹھے رہنے کی خواہش اور اپنے مستقبل کی تعمیر کا عزم ان کے دیگر تمام جذبات پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ ان میں نہ کوئی نسلی تفاخر کا جنون ہے اور نہ مذہبی تعصبات۔ تیسرا عنصر ان کی علاقائیت ہے۔ وہ بلا استثنیٰ اپنے علاقوں سے تعلق خاطر (دل لگاؤ) رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے نصب العین میں علاقائیت نسل اور مذہب کی قائم مقام ہے۔ چہارم ان کی عینیت پسندی ہے۔ ان کو عینی اور مثالی وجود کا احساس ہے۔ اگر ان کی آزادانہ نشوونما سے فطرت یا دستور یا دیگر نوع کی قیود کا بار اُٹھ جائے تو وہ پاک باطن لوگوں کی طرح کائنات کے ہم دوش اور ہم راز ہوں گے۔

ان عناصر اربعہ میں سے پہلا اور دوسرا عنصر یقیناً جمہوری ہے۔ یہ دونوں پہلو براہویوں کے جمہوری ارتقا میں کافی حد تک ممد و معاون ہوں گے۔ چوتھا عنصر ان کی وسیع انسانیت پسندی کو اُجاگر کرتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر ان کی خصوصیات کا شدید ترین اور اعلیٰ ترین عنصر تیسرا ہے۔ ان کی علاقائیت پسندی ان کے وجود کا محور ہے۔ یہ علاقائیت براہویوں کے لیے قوت اور ضعف کا وسیلہ بنی رہی ہے لیکن اگر اسے موجودہ شکل میں قائم رہنے دیا گیا تو یہ نازیبا عوامل کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ اس طرح یہ قوم ان حقیقی مسائل سے خارج از بحث ہو جائے گی جو آج کل انھیں درپیش ہیں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ براہویوں کی علاقائیت پسندی جس کا اظہار براہوئی تاریخ سے ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ اسے سمجھا جاتا ہے بہت پارینہ ہو چکی ہے۔ اب اس کے اجزا کی صفائی اور شستگی کی ضرورت ہے اور ایسا ہونا ارتقا پذیری کا لازمہ ہے۔ مثال کے طور پر اس علاقیت پسندی کو اپنے علاقے میں موجود قدرتی خزانوں کے سراغ لگانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی طرف راغب اور مصر ہونا چاہیے۔ اور ان ذخائر کی توسیع اور اضافے کے لیے سارے پاکستان سے رشتہ جوڑنا ہوگا۔ مزید برآں اس علاقے میں

جاگیردارانہ معاشرتی خاکے کو جمہوری نظام میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جس میں تمام براہوئی ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت سے شامل ہوں اور وہ محض لکڑی کاٹنے اور پانی نکالنے والے ادنےٰ کا رندے ہی نہ رہیں۔ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ اس علاقائی احساس کو محض جھالاوان اور ساراوان تک محدود رکھنے کی بجائے پاکستان کی محبت میں تبدیل کیا جائے۔ اس میں اس قدر توسیع کی جائے کہ یہ تمام پاکستان کا احاطہ کر لے۔ یہاں میں براہویوں کی طرف سے مہلک قربانیوں کا مشورہ نہیں دے رہا ہوں۔ ان کی زبان اور ثقافت کی توقیر اور ان کو قائم رکھنا ضروری ہے لیکن اس میں تغیر اشد لازمی ہے۔ اور تبدیلی فلاح و بہبود کے لیے ہو گی جس کا مطلب اپنے علاقے کی موروثی فرماں برداری اور اس کے نتیجے کے طور پر ذمہ داریوں کی توسیع کے سوا کچھ نہ ہے۔ ان کی اپنے علاقوں کی کامل اطاعت اور تحفظ کو قلات کے تنگ دائرے سے نکل کر پاکستان کے وسیع اور فراخ دائرے کی طرف منتقل ہونا چاہیے جس کا کہ یہ اہم جزو ہے۔ یہ نئی ترتیب و تطبیق قابل حصول ہے۔ یہ بات براہویوں کی فطری اہلیت سے بے جوڑ اور بے میل نہیں ہے۔ اس سے دوسرے تین عناصر ــــ لوچ اور لچک، سیاست اور عینیت کو جہاں تقویت پہنچے گی وہاں یہ خود اس سے قوت حاصل کرے گی۔ یہ چاروں عنصر مل کر ترقی کے افتخار و عظمت میں ان کے مساوی حصے کو محفوظ و مامون کر دیں گے۔